داؤد رہبر

ابا جان مرحوم[۴]

میں ان کو اباجی کہوں گا۔ ہم پنجابی میں اسی طرح خطاب کیا کرتے ہیں، مجھے یاد ہے۔ دو تین مرتبہ اباجی نے مجھ سے کہا "جب تم بڑے آدمی بن جاؤ گے تو میری سوانح عمری ضرور لکھنا" میں ان کی وصیت کا دوسرا حصہ پورا کرنے لگا ہوں۔ گو اس کے لیے جو شرط انہوں نے لگائی وہ پوری نہیں ہوئی۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ آج جو باتیں میں ان کے متعلق لکھ سکتا ہوں وہ فریاد کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی موت ایسے وقت آئی جب وہ حسرتوں کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے علمی کاموں کی تفصیل بیان کرنا میرا مقصود نہیں۔ میں صرف وہ باتیں بیان کروں گا جو بیٹے کی حیثیت سے میں نے ان میں دیکھیں۔

میں ان کی ابتدائی زندگی کا حال بہت کم جانتا ہوں۔ یہ تعجب کی بات نہیں۔ میں نے تو ان کو اسی وقت سے جانا جب وہ میرے ابا تھے۔ انہوں نے خود پہلی عمر کی باتیں تفصیل سے کبھی نہ بتائیں۔ پھر ان کا یہ زمانہ فیروز پور اور قصور میں گزرا۔ ان دونوں شہروں میں میرا جانا کبھی کبھار ہوا۔ رشتہ داروں سے ملنا جلنا زیادہ نہیں رہا۔ بڑی بڑی باتیں البتہ سننے میں آئیں۔

ان کی پیدائش کا شہر جالندھر اور سال ۱۸۹۴ء ہے۔ ۱۲۹ کتوبر تاریخ تھی۔ دادا جان، مولوی غلام

(۴۰) یعنی ڈاکٹر محمد اقبال صاحب، پرنسپل اورینٹل کالج لاہور۔

قادر صاحب ان دنوں فارسی کے استاد تھے۔ ان کے باہوش ہونے کے کچھ عرصہ بعد فیروز پور چلے آئے۔ ہمارے دادا نے بڑے دو بیٹوں کو باقاعدہ سکول اور کالج کی تعلیم دلوائی تھی۔ مگر اس کے نتائج سے مطمئن نہ تھے اور افسوس کرتے تھے کہ دینی تعلیم ان کو نہ دی۔ چنانچہ ابا جی کے معاملے میں انہوں نے اس پہلو کو تشنہ نہ رکھنا چاہا اور مسجد میں قرآن پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ اس بنیاد نے طبیعت میں سادگی پیدا کی۔ اس زمانے میں سینما اور ہوٹل نہ تھے۔ مسجد ہی سب کچھ تھی۔ شہر والوں کے پاس میلے تھے، مشاعرے تھے یا وعظ۔ مسجدوں میں وعظ اور مناظرے اکثر ہوتے۔ چنانچہ ابا جی بتایا کرتے کہ جس روز وعظ ہوتا اپنے ہم سبقوں کے ساتھ مل کر میں محلے کے سب گھروں سے تیل جمع کرتا۔ مسجد کے دیے صاف کرتا۔ دریاں بچھاتا اور گلدستے لگا کر آراستہ کر دیتا۔ پھر وعظ سے پہلے نعت خوانی کرنے والوں کو دگنا حصہ ملتا اور حالانکہ ان دنوں مٹھائی کوڑیوں کے مول ملتی تھی، اس دگنے حصے کو لے کر وہی مزا ملتا جو باغ سے پھل چرا کر کھانے میں ملتا ہے۔

ختم قرآن کے بعد سات سال کی عمر پہ پہنچ کر سکول میں قدم رکھا۔ شروع سے آخر تک اپنے ساتھیوں میں سب سے آگے رہے، پرائمری، مڈل اور دسویں کے امتحانوں میں وظیفے لیے، وظیفے کی یہ رقمیں آج ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ خود سناتے تھے کہ پرائمری کا وظیفہ چار روپے ماہانہ تھا۔ حوصلے کے مطابق طفلانہ عیاشی کر کے دو روپے بچ رہتے تھے جو میں تمہاری دادی کو دے دیا کرتا تھا۔ چوتھی تک تو سکول کی تعلیم مفت ہی ہوتی تھی۔ اس کے بعد وظیفوں کی مدد سے پڑھتے رہے اور گھر سے تعلیم کے لیے ایک پیسہ تک نہیں لیا۔ اس لحاظ سے انگریزی محاورے میں 'خود ساختہ آدمی' تھے۔

سکول کی تعلیم میں اس وقت بنیادیں مضبوط ہوتی تھیں۔ مار پیٹ بکثرت، دلوں میں خلوص اور شفقت، مگر ان پر شاذ ہی کبھی کسی استاد نے ہاتھ اٹھایا۔ تمام مضامین میں یکساں اچھے تھے، ریاضی سے خاص شغف تھا۔ ریاضی کے استاد کھڑک سنگھ کا تذکرہ بہت کرتے رہے۔ یہ بڑے سخت گیر ماسٹر تھے۔ مگر انہوں نے کبھی ان کو ناراض ہونے کا موقع نہ دیا۔ استادوں میں مولوی عزیز الدین کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا۔ ان سے اردو اور فارسی کی تحصیل کی۔ اپنے تمام استادوں کا ذکر ہمیشہ انہوں نے ادب اور تعظیم کے ساتھ کیا۔

میں نے ابا جی میں بعض باتیں ایسی پائیں جو خاص طور پر سکول کی تعلیم سے حاصل ہوئیں۔ ایک تو وہ اردو فارسی اور انگریزی کی گرامروں پر بہت اچھا عبور رکھتے تھے، دوسرے تاریخ اور جغرافیہ میں ان کا علم

وسیع تھا۔ اور تیسری چیز یہ کہ ان کو نظمیں کثرت سے یاد تھیں۔ آج کی تعلیم پر انہوں نے اکثر یہ اعتراض کیا کہ اس میں طالب علموں کو محنت شاقہ سے بچایا جاتا ہے اور ایسے کاموں سے دور رکھا جاتا ہے جن میں حافظے پر بوجھ ڈالنا پڑے۔

لڑکپن کے اس زمانے میں کھیل کود سے متنفر نہ تھے۔ کرکٹ پسند کرتے تھے۔ گھوڑے کی سواری کا بڑا شوق تھا۔ اور اس کا موقع بھی بہت ملا۔ مگر باقاعدہ کھلاڑی کبھی نہ ہوئے۔ پتنگ کا شوق مبالغے تک پہنچا ہوا تھا۔ بسنت کے لیے مہینوں پیسے جمع کرتے، کہتے تھے کہ میں بڑے بڑے پتنگ بازوں کو حسرت سے دیکھا کرتا کہ کس کس اہتمام سے پتنگ اڑاتے ہیں پر ہمت نہ ہوتی تھی کہ خاص اس کے لیے اماں سے پیسے مانگوں، اپنا مختصر سامان لے کر کوٹھے پر چڑھ جاتا اور اسی سے جی خوش کر لیتا۔ البتہ پتنگ لوٹنے میں ساری کسریں نکل جاتیں۔ بسنت کی شام کو بعض مرتبہ اچھا خاصا ڈھیر ہو جاتا۔ تضیع اوقات کے اسباب میں پتنگ بازی کے ساتھ وہ خاص رعایت سے کام لیتے۔ چنانچہ ہم بھائیوں میں اگر کوئی اس پر وقت ضائع کرتا تو کچھ نہ کہتے حالانکہ دوسرے طریقوں سے وقت ضائع کرنے پر ڈانٹتے۔ یہ ضرور کہتے کہ تم لوگ آداب پتنگ بازی سے واقف نہیں۔

نویں جماعت میں تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اس وقت اکثر چلے تھے۔ لیکن طبع سلیم نے رہنمائی کی اور سنبھل گئے۔ اس وقت ان کے لیے یتیمی آفت تھی۔ لیکن بعد میں ہم سے کہا کہ قدرت کے ہر کام میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ تمہارے دادا کا پکا ارادہ تھا کہ مجھے دسویں کے بعد ہرگز تعلیم نہ دلوائیں گے اور فوراً پٹواری کروا دیں گے۔

سکول کے بعد علی گڑھ پہنچے۔ مضامین کے انتخاب کا فیصلہ یہاں سے کر کے نہیں گئے تھے۔ خیال تھا کہ سائنس لے لیں۔ وہاں مولوی عبدالحق بغدادی عربی کے استاد تھے۔ وہ پڑھاتے تھے تو سارے کالج میں خبر ہوتی تھی کہ پڑھا رہے ہیں۔ ایسی پاٹ دار ان کی آواز تھی اور پھر آواز میں کڑک کے ساتھ رس۔ عربی اشعار اس طرح لہک لہک کر ترنم سے پڑھتے تھے کہ شاگرد وجد کرتے تھے۔ ان کا انداز دیکھ کر طبیعت للچائی اور اباجی نے عربی کو انتخاب کیا، اس کے ساتھ ریاضی کو۔ ریاضی اور عربی دونوں میں ایک سی قابلیت تھی، چنانچہ بی اے کے امتحان تک یہی ارادہ رہا کہ ایم اے ریاضی میں کریں گے۔ مگر واقعہ یوں ہوا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم ایک پرچہ ان کو پڑھاتے تھے اور خدا ڈاکٹر صاحب کو بخشے ان کے سب شاگرد جانتے ہیں کہ گو وہ ریاضی کے بڑے زبردست ماہر تھے، لیکن پڑھانے میں صد درجہ سست۔ چنانچہ وہ پرچہ

سب کا کمزور رہا۔ حتیٰ کہ امتحان میں جو سوال آئے ان میں سے ڈاکٹر صاحب نے ایک بھی جماعت کو نہ سمجھایا تھا۔ غرض پاس ہونے کے لالے پڑ گئے۔ جب پاس ہوئے تو چین کا سانس لیا اور پھر توبہ کی کہ اب ریاضی کے پاس نہیں پھٹکیں گے۔

بی اے کے زمانے میں ان کی عربی بہت قوی ہو گئی تھی۔ نصاب میں ابن بطوطہ کا سفرنامہ داخل تھا مگر اس طرح کہ جماعت میں پڑھانے کے لیے نہیں بلکہ ہدایت تھی کہ طالب علم گھر پر اس کو تیار کریں۔ ہم جماعتوں کو مصیبت پڑ گئی۔ انہوں نے کہا لاؤ یہ کون سی مشکل بات ہے میں تم سب کو پڑھاتا ہوں۔ چنانچہ پڑھایا اور عمر بھر یہ سب انہیں استاد جی کہتے رہے۔

علی گڑھ کے احسانات کے وہ عمر بھر قائل رہے۔ سناتے تھے کہ جب میں وہاں داخل ہوا تو ہوسٹل کے کمروں میں ساتھیوں کی بانٹ شروع ہوئی۔ میرے ایک پنجابی عزیز تھے۔ وہ بالا بالا اس کوشش میں کامیاب ہو گئے کہ وہ اور میں ایک ہی کمرے میں رہیں۔ مجھے اس فیصلے کا علم ہوا تو پریشان ہوا کہ میں تو یہاں اودھ اور دلی کی تہذیب حاصل کرنے آیا ہوں یہاں بھی پنجابی سے پالا پڑا۔ خیر ان کو قبول کرنا پڑا۔ لیکن ایسے کہ پھر ان حضرت کو بھی دن رات اردو بولنی پڑی اور جو دوست میں نے چنے انہیں پر ان کو بھی اکتفا کیے بنی۔ ان کے گنے چنے چار پانچ دوست تھے۔ سب کی طبیعت ظریفانہ مگر متانت کا رنگ لیے ہوئے۔ ان دوستوں میں سوائے حافظ علی اکبر کے باقی سب کو میں نے دیکھا ہے۔ حافظ جی اچھے غزل گو تھے اور علی گڑھ کے مشاعروں میں ان کی اچھی قدر تھی۔ ان کے ساتھ مل کر اباجی کلاس روم میں نظمیں کہا کرتے۔ ادھر پروفیسر صاحب لیکچر دیتے رہتے، ادھر یہ دونوں ایک ورق پر باری باری شعر تصنیف کرتے۔ ان نظموں کے بعض اشعار انہوں نے سنائے۔ ان میں ایک فرگسن نامہ تھا جو پروفیسر فرگسن کا قصیدہ تھا۔ ایک بھانڈ نامہ تھا جو علی گڑھ کے ایک جلسے کے دوران میں لکھا گیا۔ لیکن اباجی کی یہ شعر گوئی صرف ذاتی تفنن کے لیے تھی۔ ان کی شرمیلی طبیعت نے اس صلاحیت کو دل کی باتوں کے اظہار کی اجازت نہ دی۔

ہاں تو دوسرے دوست ریاض احمد صاحب تھے۔ جن سے بعد میں بھی ملاقات تازہ رہی۔ ان کا لطیفہ گوئی کے سوا کچھ مشغلہ نہ تھا۔ اباجی نے کئی دفعہ ذکر کیا کہ ریاض صاحب کے ساتھ میں علی گڑھ کے زمانے میں اس قدر ہنسا کرتا کہ جبڑے تھک جاتے۔ شاید اسی کا بدلہ مجھے یہ مل رہا ہے کہ اب مجھ میں ہنسنے کی طاقت نہیں۔ میں نے الٰہ آباد میں ریاض صاحب اور اباجی کی ایک ملاقات دیکھی۔ اس میں دونوں کو اس بے اختیاری سے ہنستے دیکھا کہ حیرت ہوئی۔ باقی دوستوں میں عبدالرؤف صاحب، اشرف حسین

صاحب اور سید بشیر علی صاحب تھے۔ یہ تینوں بڑے سنجیدہ بزرگ ہیں۔

علی گڑھ کے جتنے دوست ان سے ملتے رہے۔ انہوں نے ان کی دو باتوں کا ضرور تذکرہ کیا۔ ایک تو ان کی خوش خوراکی اور دوسرے حافظے کی قوت۔ ان کی خوش خوراکی پنجابیوں کے لیے شاید معمولی بات ہو۔ لیکن یوپی اور بہار کے نازک مزاجوں کے لیے عجوبہ تھی۔ ان کے حافظے کا ذکر اور بھی تعجب سے کیا گیا۔ ان کے دوستوں نے بیان کیا کہ ہم اکثر ان کا امتحان لیا کرتے تھے اور لمبی لمبی نظمیں دیا کرتے تھے اور یہ منٹوں میں حفظ کر کے سنا دیا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے دنوں میں انہوں نے بے شمار اشعار یاد کیے۔ مسدس ان کو شروع سے آخر تک از بر تھی۔ اکبر کا جملہ کلام یاد تھا۔ اکبر سے وہ متاثر بھی بہت تھے اور الہ آباد میں خاص ان سے ملنے گئے۔ اس کے علاوہ اقبال کی بیشتر نظمیں یاد تھیں۔ انیس کے کئی مکمل مرثیے یاد تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے اساتذہ کے چنے ہوئے اشعار گفتگو میں اکثر زبان پر آجاتے۔ پھر ایم اے کا زمانہ تھا جب امتحان کی تیاری کے ساتھ ساتھ آٹھ مہینوں میں انہوں نے قرآن حفظ کیا اور قصور کی مسجدوں میں متواتر تین سال رمضان میں سنایا۔ آپ جانتے ہیں اتنی بڑی عمر میں قرآن حفظ کرنا آسان نہیں۔ لوگ اسی لیے اکثر بچپن میں رٹا دیا کرتے ہیں۔

علی گڑھ کے زمانے میں ان کو اسلامی روایات اور تاریخ سے والہانہ محبت ہوگئی اور عمر کے آخر تک یہ محبت بڑھتی گئی۔

تعلیم یافتگی نے ان کی منکسر المزاجی کو زیادہ ہی کیا۔ چھٹیوں میں جب وہ گھر آتے تو اپنی والدہ اور دوسرے بزرگوں کی خدمت اسی سعادت مندی سے کرتے۔ کنوئیں سے مٹکے بھر کے لاتے۔ بازار سے سودا لانا بھی ان کے سپرد ہو جاتا۔ ان کی اماں ان کو بعض مرتبہ برا بھلا بھی کہتیں کہ تم بے کار کو پڑھنے لکھنے بیٹھ گئے ہو۔ تم کو بازار سے ترکاری تک خریدنے کا سلیقہ نہیں۔ فلاں کو دیکھو کیسا سیانا ہے۔ اس نے باپ کی دکان سنبھال لی ہے وغیرہ وغیرہ۔ چپ چاپ سنتے رہتے اور تعلیم و تعلم کے لمبے لمبے پروگراموں کی اہمیت سمجھانے کی کوشش نہ کرتے، نہ کبھی پلٹ کر جواب دیتے۔

دسویں سے لے کر بی اے تک کے امتحانوں کے بعد ان کو فراغت کے جو وقفے ملتے رہے۔ ان میں وہ سکول ماسٹری اختیار کر لیتے تھے۔ اس سے کچھ کمائی ہو جاتی تھی۔

ان کی شادی کا قصہ بھی عجیب ہے۔ بی اے کا امتحان دے کر علی گڑھ سے حسب معمول قصور آئے۔ اپنے گھر پہنچے تو گھر کو مقفل پایا۔ پتہ چلا کہ چند روز کے لیے گھر بدل لیا گیا ہے۔ ایک خادم سر راہ میں

ملی۔ اپنے والد کا نام لے کر پوچھا، مائی مولوی غلام قادر صاحب کے گھر والے جس مکان میں رہتے ہیں، وہ کہاں ہے۔ اس نے کہا، "شادی والے گھر کو پوچھتے ہو؟" انہوں نے کہا، "شادی کس کی؟" وہ بولی ان کے بیٹے محمد اقبال کی۔ اس خبر نے ان کو بہت دل برداشتہ کیا کہ یہ کس طرح کی شادی ہے۔ ادھر ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی مہربانیوں سے ریاضی کے پرچے خراب ہوئے تھے۔ پریشانی تھی کہ خدا جانے پاس بھی ہوں گے کہ نہیں۔ اور ادھر یہ شادی تیار ہے۔ مگر فرزندانہ تسلیم ورضا سے کام لیا۔ اور چوں چرا نہ کی۔ ساری رسموں سے گزر کر میاں بن گئے۔

عربی میں ایم اے کا امتحان دے کر وہ لاہور چلے آئے اور سنٹرل ٹریننگ کالج میں بی ٹی کی جماعت میں داخل ہو گئے لیکن کچھ دن بعد ان کو انگلستان کے جانے کے لیے حکومت سے وہ وظیفہ مل گیا جو عربی کے لیے مخصوص تھا۔ اس سے پہلے یہ وظیفہ عربی کے تجربہ کار اساتذہ کو ملا کرتا تھا۔ اس وظیفے کے دلوانے میں علی گڑھ کے پروفیسر سٹوری صاحب کا ہاتھ تھا جو ان کی عربی دانی سے متاثر ہوئے تھے۔ پروفیسر سٹوری بعد میں انڈیا آفس لائبریری کے لائبریرین ہو گئے تھے۔ اور براؤن آنجہانی کی وفات کے بعد کیمبرج میں ان کے جانشین ہوئے۔

۱۸ء میں انگلستان روانہ ہوئے۔ ابھی جہاز میں تھے کہ جنگ عظیم کے خاتمے کا اعلان ہوا۔ گئے تو وہاں عربی کی ریسرچ کے لیے لیکن پروفیسر براؤن جو ان کے نگران تھے، فارسی سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی میں کام کرنے کی رائے دی۔ فارسی انہوں نے پہلے صرف سکول میں پڑھی تھی۔ لیکن عربی جانتے ہوئے فارسی جاننا معمولی بات ہو جاتی ہے۔ چنانچہ راحت الصدور کی ایڈیشن کا کام شروع کیا۔ چار سال انگلستان میں رہے۔ ان کی زندگی وہاں خالصتاً طالب علمانہ رہی۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب وہاں سے لوٹے تو حالانکہ وظیفے کی رقم بس ضروریات کے لیے کافی تھی اور انگلستان کی گرانی عروج پر تھی، مگر واپس آتے ہوئے کتابوں کا ایک اچھا خاصا مجموعہ ساتھ لائے۔ ان کے دوستوں کی تعداد وہاں محدود تھی۔ کیمبرج کے ساتھیوں میں انعام الرحیم اور خواجہ ناظم الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ ذبیح اللہ بہروز سے بھی دوستی تھی جو ایران کے بہت اچھے پیروڈی نگار ہیں اور جن سے براؤن نے جامی پر تنقید لکھوا کر ادبیات ایران کی تاریخ میں شامل کی ہے۔ کیمبرج کے خاص دوست واجد علی خاں صاحب ہیں جو موجودہ والی رام پور کے چچا ہیں۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ کبھی رام پور میں وزیر صنعت تھے۔ آج کل درویشانہ وضع اختیار کی ہے اور گولڑہ شریف کے پیر صاحب سے بیعت کر لی ہے۔ ان کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ

سکتا کہ نو سال انگلستان میں رہے۔ ہمارے ہاں اکثر آتے رہے۔ انہوں نے ایک روز ہم سے کہا، "تمہارے ابا کتابوں وتابوں کے پھیر میں پڑے رہتے تھے، ہم تو لڑکیوں کو چاکلیٹ کھلایا کرتے تھے"۔

کیمبرج میں ابا جی کی لینڈ لیڈی ہندوستانی کھانا خوب پکاتی تھی۔ اس کھانے کی کشش میں ہندوستانی طالب علم ان کے ہاں بکثرت آتے تھے اور یہ مہمان نوازی سے کام لیتے تھے۔

براؤن کے ساتھ ان کو چار سال قریبی تعلق رہا۔ تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ براؤن کے متعلق دلچسپ باتیں سناتے تھے۔ ایک تو یہ کہ براؤن کے فکر کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ زبان یارا نہ کرتی تھی۔ چنانچہ اکثر فقروں کو ادھورا چھوڑ جاتے تھے، پھر یہ بتایا کہ میں اکثر براؤن کا کتاب خانہ دیکھا کرتا۔ ان میں جتنی کتابیں کھول کر دیکھتا، شروع کے اوراق پر نشانیاں اور یادداشتیں ہوتیں۔ باقی کتاب صاف۔ بس وہ شروع ہی کے صفحے پڑھا کرتے۔ اور اسی سے کتاب کی مجموعی قدر پر حکم لگا دیتے۔ جن لوگوں نے ان کی تاریخ ادب پڑھی ہے، جانتے ہیں کہ وہ ہر ادبی تصنیف کی فہرست مضامین بیان کرنے پر قناعت کرتے ہیں یا مثلاً ایسی باتیں بیان کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ممدوحین کی تعداد کیا ہے وغیرہ۔ ادبی تنقید بہت کم کرتے ہیں۔

انگلستان کے زمانے میں ابا جی نے چار اور زبانیں سیکھیں۔ یعنی عبرانی، سریانی، جرمن اور فرنچ۔ جرمن اور فرنچ کی کتابیں انہوں نے اردو میں ترجمہ بھی کی ہیں۔ بہت سے جرمن اشعار بھی یاد کیے، تحقیق کے سلسلے میں کچھ زمانہ پیرس میں بھی گزارا۔

۲۲ء میں وہ انگلستان سے واپس آئے لیکن ایسا نہ ہوا کہ انگلستان کی برتر زندگی کے بعد ان کو یہاں کی زندگی سے حقارت ہو جائے۔ واپس آئے تو اسی سادگی کے ساتھ۔ قصور کے اسٹیشن پر جب وہ اترے تو ان کی حد سے بڑھی ہوئی ہندوستانی وضع دیکھ کر ایک رشتہ دار نے کہا، "آپ ولایت سے آئے ہیں یا کوٹ رادھا کشن سے؟" ان کی وضع عمر بھر ہندوستانی رہی۔ انگلستان ہی میں ان کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شعبہ فارسی کی صدارت پیش کی گئی اور پروفیسر بننے کی وہ آرزو جو سکول کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی پوری ہو گئی۔ ۲۶ سال اسی جگہ پر رہے۔ ان کی زندگی کے ایسے پہلو جو انسانیت کے لحاظ سے قابل یادگار ہیں، اسی زمانے میں پیدا ہوئے۔

لاہور میں آ کر ان کی طبیعت میں بڑی رنگینی پیدا ہو گئی۔ ہندوستانی موسیقی کا شوق جو بچپن سے تھا ترقی پکڑ گیا۔ اس شوق میں ان کے خاص ہم مشرب پروفیسر سراج الدین آذر مرحوم تھے۔ جو موسیقی کے

علاوہ کتابوں کے دلدادہ بھی تھے، اور ان کا مجموعۂ کتب نوادر سے پُر ہے۔

۱۹۲۶ء میں صاف ستھری جگہ رہنے کا شوق ان کو ماڈل ٹاؤن لے آیا۔ ماڈل ٹاؤن لاہور سے باہر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اس وقت یہاں جنگل ہی جنگل تھا۔ لوگ شکار کو آتے۔ گنتی کے چار پانچ مکان تھے۔ لاہور سے آنے جانے کا ذریعہ کچھ نہ تھا۔ موٹر سائیکل خرید لیا۔ مگر یہاں آ کر جنگل میں منگل کیا اور موسیقی کی محفل برپا کی۔ معمول یہ بندھا کہ ہفتے کی شام آذر مرحوم ماڈل ٹاؤن آ جاتے۔ ماسٹر شمس الدین مرحوم آ جاتے۔ وہ ذات کے میراثی نہ تھے، جولاہے تھے۔ اباجی کے پاس بڑے چاؤ سے آتے اور کہا کرتے کہ گانے کا مزا یہیں آتا ہے۔ آپ اسی چیز کی فرمائش کرتے ہیں جو میرے دل سے قریب ترین ہے۔ وجہ یہ کہ اباجی صرف ٹھیٹھ استادی چیزیں سنتے تھے۔ ٹھمری، ٹپہ اور دادرا تک ان کو برداشت نہ تھے۔ صرف خیال، دھرپد اور ترانہ سنتے تھے۔

شیرانی مرحوم اتوار کو محبت کی راہ سے آ جایا کرتے، گو وہ گانے بجانے سے سخت متنفر تھے۔ ماڈل ٹاؤن کے محتاج وغنی کے لیے صلائے عام تھی، ویرانے کے اکتائے ہوئے سب جمع ہو جاتے۔ حفیظ جالندھری بھی برابر کے مکان سے آتے۔ بروا مارواسے چل کر مالکونس تک پہنچتے اور رات کے گیارہ بجے سوتے۔ اتوار کو صبح سویرے اٹھتے اور کالنگڑا سے شروع ہو کر تونڑی اور سارنگ تک آتے، طبلہ کبھی اباجی کے سامنے ہوتا کبھی آذر صاحب کے سامنے۔ اتوار کی شام بھی محفل ہوتی اور بعض مرتبہ پیر کی صبح آخری مجلس ہو کر سلسلہ ٹوٹتا۔ طبلے میں اباجی نے اچھی مہارت پیدا کی۔ طاؤس پر بھی ہاتھ رواں ہو گیا تھا۔ ماسٹر شمس الدین جن کا میں نے ذکر کیا، گو ان کی آواز بہت رسیلی نہ تھی لیکن بے مثال صاحب ذوق تھے۔ ریاستوں میں کپڑا بیچنے جاتے اور اساتذہ سے اچھی اچھی چیزیں حاصل کر کے آتے۔ مجھے تو اس زمانے میں اچھی طرح ہوش نہ تھا۔ لیکن بعد میں اباجی نے جب شمس الدین کی بعض چیزیں گنگنا کر سنائیں تو حیرت ہوئی۔ ریڈیو پر جو خیال ترانے سننے میں آتے ہیں، ان میں ان چیزوں کے پاسنگ بھی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ان کو افسوس ہمیشہ اس بات کا رہا کہ موسیقی کا فن بڑا ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ فنون لطیفہ میں اس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔

جولائی ۱۹۲۹ء میں دلخستہ اماں کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اباجی کی عمر چونتیس برس تھی۔ یہ ان کی زندگی کا بہت بڑا موڑ تھا۔ ان کی شگفتگی کا خاتمہ ہو گیا۔ ہم پانچ بھائی ہیں اور سب میں چھوٹی ایک بہن ہے۔ بہن کی عمر اس وقت نو ماہ تھی۔ سب سے بڑے بھائی کی گیارہ سال۔ باقی سب بھائیوں کی عمریں چھ برس سے

بچے۔ اس وقت انہوں نے تہیہ کر لیا کہ پھر شادی نہ کریں گے۔ دو ایک سال گزرنے پر دوستوں نے فہمائش کی کہ شادی کے بغیر بچوں کا سنبھالنا آسان نہیں۔ مرحوم سر اقبال نے بھی کئی بار ان سے یہی کہا مگر ٹالتے رہے۔ ماں کے تمام فرائض اپنے کندھوں پر اٹھا لیے۔ نہ کوئی انا رکھی، نہ رشتہ داروں میں کسی عورت سے مدد لی۔ مجھے ان کی ابتدائی مشقتوں کا پورا تصور نہیں مگر ان دنوں کا اچھا خاصا نقشہ ذہن میں ہے۔۔ جب وہ چاروں چھوٹے بچوں کو اپنے ہی بستر پر ساتھ سلا لیتے۔ بچے جن مختلف طریقوں سے رات کو جگاتے اور پریشان کرتے ہیں اس کا آپ کو اندازہ ہے۔ کبھی کمبل اتر گیا ہے، کبھی نیند اچٹ گئی ہے۔ اب کپڑے بدلنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ پھر گھر کی دیکھ بھال، سودا سلف لانا، صفائی کا اہتمام۔ غرضیکہ تمام گھریلو ضروریات کا پورا کرنا یہ بھی اپنی جگہ اس سے بڑا کام ہے جس سے ان کو آخری دم تک فرصت نہ ملی۔ اس کے ساتھ آپ یونیورسٹی کے بھاری فرائض کا تصور بھی رکھیے۔

جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو ماں اور باپ کی حیثیتوں کے علاوہ انہوں نے استاد کی جگہ بھی لے لی اور جس کو جس مضمون میں ذرا بھی توجہ دی وہ ہمیشہ کے لیے اس مضمون میں تیز ہو گیا۔ سب سے بڑے بھائی کو ریاضی میں چمکایا۔ مجھے عربی پڑھائی۔ سو اب تک میں نے ساتھیوں میں کبھی کسی کو اس میں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ مضامین کے انتخاب میں انہوں نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ ان کو اس کا بڑا شوق تھا کہ ہم ان سے اپنے مضامین میں مدد لیا کریں اور جب کئی کئی روز ہم پڑھنے لکھنے سے کتراتے تو بہت ناراض ہوتے، برابر محنت پر آمادہ کرتے۔ امتحانوں کے اچھے خاصے نتیجوں پر ان کو تسلی نہ ہوتی اور یہ کہتے کہ تمہیں اپنی ہمت سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہے۔ مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں تمہاری سفارشیں کرتا پھروں گا۔ میں نے خود اپنے لیے زندگی میں کسی کے سامنے سوال کا ہاتھ نہیں پھیلایا۔ خدا کے لیے مجھے اس ذلت سے بچائے رکھنا۔

شروع شروع میں ان کو ایک مشکل رہی۔ جب وہ کالج جاتے تو ہماری نگرانی کی طرف سے مطمئن نہ ہوتے۔ چنانچہ موٹر میں سب کو ساتھ لے جاتے۔ کالج کے کمرے کے باہر موٹر کھڑی کر دیتے۔ کھانے کو پھل اور بچوں کی مٹھائیاں وہیں مہیا ہو جاتیں۔ ذرا ذرا دیر بعد کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیتے کہ خیریت ہے۔

صبح شام سب کو سیر کے لیے لے جاتے۔ ان کو ہر وقت یہ خیال رہتا کہ ہم سب ہر وقت ان کی آنکھوں کے سامنے رہیں جب ہم میں سے کوئی کسی غرض سے باہر جاتا اور واپسی میں دیر ہو جاتی تو

دروازے پر آ کر بے چینی سے ٹہلتے رہتے اور جب وہ آ جاتا تو جان میں جان آتی اور کہتے کہ تم کسی روز میری جان لے کر رہو گے۔

اماں کی وفات کے بعد انہوں نے محفل نوازی اور رنگینی بالکل چھوڑ دی۔ آذر مرحوم نے دبی زبان سے کئی مرتبہ کہا کہ اب اس گھر کی دیواروں کو پھر نیک آوازوں کی ضرورت ہے۔ مگر سازوں پر جو غلاف ایک مرتبہ چڑھ گئے پھر نہ اترے آخر وقت تک طبلہ، سارنگی، طاؤس، دلربا اور طنبورہ کسمپرسی میں پڑے رہے۔ شمس الدین دو ایک سال وقفہ دے کر آئے۔ ان کا دل رکھنے کو ان سے کچھ سنا۔ مجھے یہ آخری محفل یاد ہے لیکن اس کے بعد جب میں نے گانے کا شوق پیدا کیا تو اس پر وہ معترض نہ ہوئے۔

جس زمانے میں ہم سنٹرل موڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ اباجی موٹر پر ہمیں سکول خود پہنچا کر آیا کرتے تھے۔ موٹر ہمیشہ خود چلاتے۔ اٹھارہ انیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کبھی نہ بڑھے۔ ان کے کالج کے اوقات تقریباً گیارہ سے ایک بجے تک ہوتے۔ لیکن محض ہماری خاطر سے نو بجے پہنچ جاتے۔ ابھی کالج میں جنگلی جھاڑو دے رہا ہوتا۔ اسی ویران اور اداس فضاء میں جا کر بیٹھ جاتے۔ پھر ڈیڑھ دو بجے کالج چھٹی کے بعد خالی ہو جاتا۔ تنہائی میں وقت کاٹتے رہتے اور انتظار کرتے کہ چار بجے ہمیں چھٹی ہو تو ہمیں ہمارے سکول سے اور بہن کو اس کے سکول سے لے کر واپس چلیں۔ اس وقت ایک عجیب ناگوار بات ہوتی۔ ماسٹر صاحبان اکثر چھٹی کی گھنٹی کے بعد چار پانچ منٹ تک سب لڑکوں کو روکے رکھتے۔ گھر کا کام دیا جاتا۔ اباجی باہر بیٹھے جھنجھلاتے اور جب ہم پہنچتے تو ناراض ہوتے کہ میں یہاں کھڑا سوکھتا رہتا ہوں تمہیں میرا کچھ خیال نہیں۔

عام ملنا جلنا انہوں نے بالکل ترک کر دیا تھا۔ لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہ کی۔ ہم سے کہا کرتے تھے لوگ شام گزارنے کو کلب چلے جاتے ہیں۔ مجھے اس کی کیا ضرورت ہے، میرے دوست میرے بچے ہیں۔ ہم سے خوب بے تکلف بھی تھے مگر ساتھ ہی اپنا رعب کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کو دیکھ جہاں محبت کی لہر اٹھتی ہے، اس کے ساتھ ہی ڈر کی لہر بھی آتی تھی۔

البتہ شیرانی صاحب سے دوستی بڑھتی گئی۔ طبیعتوں میں ہم مذاقی۔ گھنٹوں ساتھ رہتا تھا۔ آخری مرتبہ وہ ڈھائی مہینے ہمارے ہاں آن کر رہے۔ وہ عزیزوں سے بڑھ کر عزیز تھے۔ موٹر سائیکل کی پچھلی گدی پر بیٹھ کر گرتے سنبھلتے اباجی کے ساتھ آ جاتے۔ موٹر سائیکل کو وہ خر دجال کہا کرتے تھے۔ اکثر اتواریں یہاں آ کر گزارتے۔ ہم سے کہا کرتے تھے تمہارے اباجی کا میں بڑا احترام کرتا ہوں۔ انہوں

نے تمہارے لیے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ گو وہ عمر میں مجھ سے پندرہ برس چھوٹے ہیں لیکن مجھے ڈانٹ بھی لیتے ہیں۔ ان کے غصے کا برا ماننے کی مجھ میں قابلیت ہی نہیں۔ اباجی سے کہتے تھے میں براؤن صاحب کی خبر لوں لیکن آپ کے استاد جی ہیں۔ اس لیے جانے دیتا ہوں۔ اور واقعی براؤن پر تنقید نہ کرنے کا یہی سبب تھا۔ شیرانی صاحب گو ہم بچوں میں بیشتر وقت گزارتے تھے لیکن اباجی سے باہم خانگی معاملوں کے جھگڑوں پر گفتگو بہت کم ہوتی تھی۔ وہ اپنے فرزند اختر شیرانی سے نالاں تھے لیکن سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی ان کا ذکر آتا۔ اباجی سے کہا کرتے تھے یہ داؤد مجھ سے لے لیجئے اور اپنا داؤد مجھے دے دیجئے۔ اکثر دونوں کی علمی گفتگو ہوتی تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ پروفیسر حبیب نے خزائن الفتوح کی جو ایڈیشن تیار کی تھی اس کی تنقید پر شیرانی صاحب کو اباجی نے لگایا تھا۔ اسی طرح شمس العلماء مولوی عبدالغنی کی کتاب "مغلوں سے قبل کا فارسی ادب" کی طرف بھی انہی نے توجہ دلائی اور اس کا تبصرہ ہمارے گھر میں رہ کر شیرانی صاحب نے لکھا۔

گو انہوں نے خود آگے بڑھ کر دوستانہ ملاقاتیں کرنا ترک کر دیا تھا۔ لیکن جب دوسرا کوئی آتا تو نہایت تپاک اور خلوص سے ملتے۔ ان کے تمام جاننے والے ان کی مہمان نوازی کے ہمیشہ قائل رہے۔ جن بزرگوں کے آنے سے ان کو بہت خوشی ہوتی ان میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب، ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب اور ان کے علی گڑھ کے پرانے ساتھی ہیں جن کا ذکر میں کر چکا ہوں۔

تاہم ان کا سب سے خوشگوار وقت ہم بچوں میں صرف ہوتا تھا۔ مامتا ان کی طبیعت کا ایسا جز بن گئی تھی کہ وہ دوسروں کے بچوں کو دیکھ کر بھی پیار کرنے کے لیے بےتاب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ان کی ایک بھتیجی اپنے بچے کو لے کر آئیں۔ گرمی کے سبب رات کو وہ بچہ رونے چیخنے لگا۔ ماں ذرا دیر میں گھبرا گئی۔ اباجی دو تین گھنٹے اسے لے کر باہر باغیچہ میں گھومتے رہے۔ یہ سب کچھ برداشت سے نہیں کیا بلکہ مسرت حاصل کرنے کو۔ آخر جب بچہ سو گیا تو خود جا کر لیٹے۔

سیر کو جاتے تو اکثر کسی کو ساتھ لے جاتے۔ مجھے چونکہ انہوں نے عربی فارسی علوم کے لیے انتخاب کیا تھا۔ اس لیے اکثر مجھے ساتھ رکھتے۔ اس میں محبت کی زیادتی کو دخل نہ تھا بلکہ محض مجھے اپنی معلومات سے بہرہ مند کرنا مقصود تھا مجھ سے ہمیشہ اردو میں باتیں کرتے۔ میں اس معاملے میں ایک عجب قسم کی جھجک محسوس کرتا۔ ہر وقت اشعار سناتے رہتے۔ اس میں عمر کا لحاظ رکھا۔ شروع شروع میں حالی، اکبر،

اسمٰعیل میرٹھی اور اقبال کے چنے ہوئے اشعار سنائے۔ جب ہم بڑے ہوئے تو غزلوں کے اشعار سنانے لگے اور کہا کہ اب تک میں نے ایسا کلام اس لیے تمہیں نہیں سنایا تھا کہ تمہاری عمر سے اس کو مناسبت نہ تھی۔ اس سے مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ جب میں نے شعر کہنا شروع کیا تو سچائی اور محنت کی قسم کے مضامین پر۔ ایک روز میں مشاعرے میں گیا، وہاں غزلیں سنیں اور واہ واہ سے بہت مرعوب ہوا اور جی میں کہا شاعری تو یہ ہے میں تو جھک مارتا رہا ہوں۔ آتے ہی میں نے بھی ایک غزل کہی جس میں مرض عشق اور وصل یار کے مضمون تھے۔ حالانکہ مجھ میں ان باتوں کا شعور مطلق پیدا نہ ہوا تھا۔ میں نے یہ غزل ابا جی کی میز پر رکھ دی کہ دیکھ کر داد دیں گے۔ دوپہر جب میں کھانے کی میز پر آیا تو ان کو سخت غصے میں پایا۔ پہلے تو چپ رہے، آخر ڈانٹ شروع ہوئی کہ یہ مسلمانوں کے بچے خدا جانے کس طرح کے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے تو خمیر میں آوارگی اور بدچلنی ہے۔ میں چپکا بیٹھا سنتا رہا، کئی روز اس پر ناراض رہے۔

دس بارہ سال صبح شام میں ان کے ساتھ سیر کو جاتا رہا۔ اس دوران میں انہوں نے جتنی باتیں مجھے سکھائیں ان میں سے گو مجھے بہت کم یاد رہتی تھیں لیکن انہی باتوں کے بل پر آج بھی محفل میں آن رہ جاتی ہے۔ ورنہ میرا اپنا مطالعہ ہیچ ہے۔

سردیوں میں سویرے پانچ بجے اٹھ کر سیر کرتے۔ واپس آ کر سرد پانی سے غسل کرتے تھے۔ پھر خود چائے تیار کرتے۔ اس کو صبوحی کہتے تھے۔ خیام کی کسی رباعی کا انگریزی ترجمہ بلند آواز سے پڑھتے، یہ ہمیں جگانے کا طریقہ تھا۔ جو چائے پینا چاہتا اسے پلاتے۔ اصرار کرتے کہ تم بھی سیر کو چلا کرو۔ میں نے حامی بھرلی۔ اگلے روز صبح مجھے جگایا۔ دیکھا تو کوٹ پہن چھڑی ہاتھ میں لیے تیار کھڑے ہیں۔ مجھے انہوں نے اتنی فرصت بھی نہ دی کہ ذرا آنکھیں تو اچھی طرح کھولوں۔ دیکھتے دیکھتے صحن کے دروازے پر پہنچ گئے۔ میں نے بہ مشکل کوٹ پہنا، لپکتا ہوا جوتے کا تسمہ باندھتا، دوڑا۔ اس کے بعد کئی دفعہ ادب کے ساتھ میں نے جتایا کہ یوں جانا مشکل ہے آپ ذرا پہلے جگا دیا کریں۔ مگر ہمیشہ اسی بھاگم دوڑ میں مجھے صبح سیر کو جانا پڑتا۔

کالج کے کمرے میں جب میں جاتا تو اکثر کسی شعر سے استقبال کرتے ۲۲ء میں میں کشمیر گیا تو انہوں نے اردو نظم میں خط لکھنے شروع کیے۔ میں نے بھی جواب نظم میں لکھے۔ آخر یہ طریقہ فرسودہ ہونے لگا تو عربی نظم میں خط لکھا۔ میں نے لنگڑی سی عربی میں منظوم جواب لکھا۔ اس کے جواب میں اردو رباعی لکھی۔ اس کا مطلع یہ تھا۔

تم شعر کے امتحاں میں پورے اترے

ہم بھائی اپنے ہم عمروں کی ہم مجلسی کے لیے جب ان سے دور ہوتے تو وہ محبت سے مایوس ہوتے اور کہتے کہ میری محبت تو قدرت کا ہتھیار ہے۔قدرت کو مجھ سے تمہاری پرورش کرانی ہے۔

ان کی گفتگو میں ظرافت کبھی کبھار ہوتی تھی۔ لیکن سنجیدہ ظرافت کی ان کو بڑی تلاش تھی۔ وہ انگریزی ظرافت کے بہت قائل تھے اور مشرقی ادب میں اس کی بڑی کمی محسوس کرتے تھے۔ بہت عرصے تک وہ انگریزی رسائل سے اچھے لطائف کے چربے کاٹ کر ایک کاپی میں ان کو چپکاتے رہے۔ یہ مجموعہ اب تک محفوظ ہے۔اور بہت خوب ہے۔

بعض مرتبہ غصے میں بڑے لطف کی باتیں کہتے۔ایک دفعہ ٹہل رہے تھے۔ ماڈل ٹاؤن سوسائٹی کا الیکشن آ رہا تھا،ایک ہندو امیدوار جس سے ملاقات نہ تھی ان کے پاس آ کر رک گیا۔آداب کے بعد کہنے لگا، ڈاکٹر صاحب بہت ہی خاموش آدمی ہیں۔ ایسے شریف آدمی کہاں ہوتے ہیں، ابھی تمہید یہیں تک پہنچی تھی کہ اباجی نے ٹوک دیا اور کہا،"ووٹ کا وعدہ تو ایک اور صاحب مجھ سے لے گئے ہیں"۔

ایک روز میں کالج میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ایک ریسرچ سکالر آیا اور کہنے لگا فلاں صاحب کی نگرانی میں میں نے ریسرچ کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دیباچے میں آپ کا شکریہ بھی ادا کردوں۔انہوں نے کہا،"میرے شکریے کا کیا موقع ہے؟" وہ بولے،"آخر آپ اس کالج کے پرنسپل ہیں اور ایسے فاضل ہیں"۔بگڑ کر کہنے لگے،"تو پھر اس مالی کا شکریہ کیوں ادا نہیں کرتے جو کالج کی سڑک پر چھڑکاؤ کرتا ہے"۔

آخری عمر میں ان کا حافظہ نسبتاً ماند پڑ گیا تھا۔لیکن اس پر بھی ہم نوجوانوں سے کہیں اچھا تھا۔انہوں نے کبھی ڈائری نہ رکھی۔ان کی مصروفیات گھریلو اور دفتری دونوں طرح کی ہوتی تھیں، مگر کبھی کوئی پروگرام خطا نہ جاتا۔بچوں کی فیسیں، طرح طرح کے بل سب ادا ہو جاتے، تمام جلسوں میں شرکت ہو جاتی۔ان کا حافظہ اعداد کے لیے خوب تھا۔کسی آشنا کی موٹر ہوتی، نمبر دیکھ کر بتا دیتے۔دنیا کی تاریخ کا کوئی واقعہ انہوں نے کبھی صحیح سال کے ذکر کے بغیر بیان نہیں کیا۔

تاریخ عالم کے وسیع مطالعے سے انہوں نے بہت سے نتائج خود اخذ کیے تھے۔جن کا ذکر وہ کرتے تھے۔ مثلاً وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ صحیح اسلامی کلچر ہندوستان میں آیا ہی نہیں بلکہ یہ ایران، منگولیا اور افغانستان کا ملا جلا کلچر تھا اور مسلمانوں کا داخلہ ہمارے ملک میں اس وقت ہوا جب اسلامی ثقافت تنزل پذیر ہو چکی تھی۔ان کا خیال تھا کہ اس نظریے کو کتابی شکل میں پیش کریں اور اس پر مواد جمع

کرتے رہے۔

ان کی زبان دانی بھی قابل رشک تھی، ہر زبان کا صحیح تلفظ جب تک نہ سیکھتے تسلی نہ ہوتی۔ عربی کا تلفظ خالص مصری تھا، جرمن اور فرانسیسی کا تلفظ بھی نہایت صحیح تھا۔ فارسی کا جدید لہجہ انہوں نے سیکھا۔ جدید فارسی روانی سے بولنے لگے تھے۔ اس میں ایران کے سفر سے بہت فائدہ ہوا تھا۔ جس کے لیے ۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی نے انہیں بھیجا تھا۔ آخری زمانے میں وہ پہلوی بھی سیکھ رہے تھے اور ایران قدیم پر ان کی توجہ خاص طور مرکوز ہو گئی تھی۔

ان کے کتاب خانے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس میں تقریباً ۳۵۰۰ جلدیں ہیں۔ قلمی کتابیں کل بیس پچیس ہیں باقی سب چھپی ہوئی ہیں۔ عربی کی کتابیں سب سے زیادہ ہیں۔ اسلامی تاریخ، فارسی ادب اور ایرانیات پر اس کے بعد اور سب سے نیچے اتر کر ہندوستان کی تاریخ اور اردو ادب۔ نہایت منتخب کتابیں ہیں۔ بڑے ذوق سے مجلد کرائی ہیں۔ وہ کتاب کی ظاہری خوب صورتی کو بھی بے حد اہمیت دیتے تھے۔ میرے خیال میں میرے مخدوم استاد مولوی محمد شفیع صاحب کے کتاب خانے کے سوا لاہور میں اسلامیات کا کوئی ذاتی کتاب خانہ اس مجموعے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی میں یہ کتاب خانہ انہوں نے کسی کو نہ دکھایا۔ انہیں تمام علماء کی طرح کتاب ادھار دینے کا بہت برا تجربہ ہوا تھا۔ اس کتاب خانے میں ہلکا پھلکا ادب بالکل نہیں۔ وہ ایسا ادب پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ عمر بھر وہ کوئی ناول مکمل نہ پڑھ سکے۔ میں نے بارہا ان کو نہایت ٹھوس علمی کتابیں تفریحاً پڑھتے دیکھا ہے۔

ان کے شاگردوں کو معلوم ہے کہ وہ باوجود اس کہنہ مشقی کے کبھی بغیر تیاری کے لیکچر نہ دیتے تھے۔ ایک موضوع پر سال بہ سال جو نئی تحقیق ہوتی تھی، اس کی معلومات کا لیکچروں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ لیکچر نہایت باقاعدگی سے دیتے تھے، مختلف کالجوں کے لڑکوں کی سہولت کے لیے ایک ہی لیکچر ہفتے میں تین تین بار دینے سے گریز نہ کرتے تھے۔ نوٹ لکھانے کے وہ قائل نہ تھے۔ اسلامی تاریخ سے طالب علموں کی ناواقفی کی بہت شکایت کرتے تھے۔

ان کی صحت کے خراب کرنے میں ایک بہت بڑا حصہ اس تاسف کا تھا کہ بچوں کی پرورش ان کے علمی کام میں بہت حائل رہی۔ آخری دنوں میں وہ اپنے کتاب خانے کو حسرت سے دیکھتے رہتے تھے کہ اس کاوش سے یہ چیزیں جمع کی ہیں اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ مایوسی میں مجھ سے کہتے کہ اس کتاب خانے سے اب تم ہی کام لینا۔ تاہم جب امید کی لہر آتی تو کہتے کہ تم سب مجھے فارغ کر دو تو میں مستقل

ہو کر باقی عمر قسطنطنیہ، مصر اور یورپ میں گزار دوں اور کچھ کام کر جاؤں۔

ان کی گوشہ گیری بے نظیر قسم کی تھی۔ یونیورسٹی سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ کئی سال یہاں تعلیم کی فضا سیاست کا اکھاڑہ بنی رہی۔ دنگے، جماعتیں، ووٹ بازی، ان کو کسی سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ اس پر بھی نالاں رہتے تھے کہ ضمنی طور پر کئی کمیٹیوں کے ممبر تھے اور لوگ چین نہ لینے دیتے تھے۔ کہا کرتے تھے مطلعی کاہے کی ہے۔ کلرکی اور لیڈری باقی رہ گئی ہے۔ جب پرنسپل مقرر ہونے والے تھے تو اسے مصیبت سمجھتے اور ہم سے کہتے کہ کسی طرح مجھے اس سے چھٹکارا مل جائے تو اچھا ہے۔

جن لوگوں نے ان سے ملاقات کی سب سے پہلے وہ ان کی سادہ وضع سے متاثر ہوئے۔ سادہ ترین لباس پہنتے، ماڈل ٹاؤن کی سیر میں ان کو یہی بات پسند تھی کہ جو لباس گھر میں پہن رکھا ہے اسی میں اٹھ کر نکل جاؤ۔ سیر بھی ان اطراف میں کرتے جہاں کسی کے ملنے کی توقع نہ ہوتی۔ وہ صفائی اور افادہ کے قائل تھے۔ تزئین سے ان کو رغبت نہ تھی۔ موٹر پرانی ہوگئی تو کیا، کام دے رہی ہے۔ موٹر کو نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھا اور صاف رکھا۔ اس سے ان کو محبت ہوگئی تھی کہ پرانی خدمتگار ہے۔ میں اپنے کمرے کو کبھی سجاتا تو کہتے اتنا اہتمام کیوں کرتے ہو۔ بس اتنی صفائی رکھو جو قائم رہے۔ ان کی یہ سادگی اسلوب بیان اور خط میں بھی دیکھی۔

ان کا انکسار حد سے بڑھا ہوا تھا۔ اپنے بچوں کی تعریف کبھی نہ کرتے، اور ان لوگوں کو ناپسند کرتے تھے جو اپنے بچوں کے گن گاتے رہتے ہیں۔ اپنے انگلستان اور ایران جانے کا ذکر آتا تو جلدی سے ٹال جاتے۔ ایک مرتبہ ایک مہمان نے قرآن کی ایک آیت غلط پڑھی اس کی درستی نہ کی اس خیال سے کہ حفظ قرآن کا اشارہ ہو جائے گا۔ ایران کی علمی اکیڈمی نے ان کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے اعزازی رکن نامزد کیا۔ اس کو بالکل پوشیدہ رکھا۔ شعرالعجم کے مقالہ خیام پر انہوں نے جوانی میں جو سخت تنقید کی تھی۔ شیرانی صاحب نے جب تنقید شعرالعجم کی جلد میں اسے شامل کر دیا تو اس پر بہت برہم ہوئے اور اس مضمون کے سخت لہجے کے بارے میں شیرانی صاحب سے معذرت کے الفاظ اضافہ کرائے۔ اسی انکسار کا ایک پہلو کم گوئی تھا۔ بارہا محفل میں ان کے ہونٹ گفتگو کے لیے ہلنے لگتے لیکن یہ سوچ کر کہ بات معمولی ہے رک جاتے۔ مگر جو بات کہتے بڑی نپی تلی، مجمل اور عرصے کے سوچ وبچار کا نتیجہ ہوتی۔ ان سے جب کوئی شخص مشورہ مانگتا تو بہت دیر کی مہلت مانگتے اور نہایت صائب مشورہ دیتے۔

ان کے محبوب موضوع اردو زبان اور اسلام کا مستقبل تھے۔ اسلام کے دین سے بڑھ کر ان کو اس

کلچر سے الفت تھی جو اسلام سے پیدا ہوا۔ مذہب کے معاملے میں انہوں نے عقیدت اور منطق کو ایک دوسرے سے الگ رکھا تھا اور کہا کرتے تھے کہ مذہب کی بحث منطق کی اصطلاحوں میں نہیں ہو سکتی۔ یہ جذباتی تسلیم و رضا کی چیز ہے۔

ان کی نرم دلی ہمارے لیے باعث حیرت تھی۔ شکار سے ان کو نفرت ہو گئی تھی۔ نوکروں پر کسی طرح کی سختی نہ کر سکتے تھے۔ بے حد شفقت سے انہیں رکھتے تھے، ہماری تکلیفیں تک ان کو گوارا تھیں لیکن ملازم کا رنج منظور نہ تھا۔ بیس بیس سال کے پرانے نوکر اب تک کام کر رہے ہیں۔ حاجت مندوں کی مدد ان کا ایمان تھا۔

میرے ذہن میں ان کی جو تصویر عمر بھر رہے گی وہ یہ ہے۔ اپنی چارپائی پر کمبل اوڑھے بیٹھے ہیں اور اپنے حساس دل کے صدموں کو حقے کے کش لگا کر ہلکا کر رہے ہیں۔ اسلام کے تنزل کا ذکر کرتے ہیں اور آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔ حالی اور انیس پڑھ کر روتے ہیں۔ جب بچے اٹھ کر اپنے مشاغل میں لگ جاتے ہیں تو وہ گھنٹوں بیٹھے دیواروں کو دیکھتے ہیں۔ دنیا اور انسان سے قطعی مایوس ہیں۔ یہی مایوسی ان پر ہر وقت چھائی ہے۔ چہرے پر بیس سال کی کڑی زندگی کے آثار ہیں۔ تھکن کے الگ نقوش چہرے پر پیدا ہو گئے ہیں۔ اپنی زندگی کے اکارت جانے کے ماتم میں گھلتے جاتے ہیں۔ کسی سے اپنا دکھڑا نہیں روتے۔ اور کسی شریک غم کی تلاش میں نہیں ہیں۔ جب مسرت میں شریک ہونے والی بیوی نہ رہی تو شریک غم کسے کریں۔